03

متعلقہ سوال کا جواب صرف مختص کردہ جگہ پر اور بیرونی نشان کے اندر دیا جائے۔

22436302

سوال نمبر 2 (الف)۔ ۱

باپ کو پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات وہ کسی کام سے بستر سے اُترا۔ چونکہ وہ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا اس لیے سرد اور تند ہوا کسی تیر کی طرح اُس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ چنانچہ وہ ٹھنڈ لگنے کی وجہ سے بیمار ہوا۔

سوال نمبر 2 (الف)۔ ۲

اُس کے گھر والے چونکہ اُس سے بے پناہ محبت کرتے تھے اس لیے انہوں نے بیماری کے دوران اُس کا بہت خیال رکھا۔ بیٹوں نے اُس کا بہت علاج کروایا۔ مختلف جگہوں سے اس کا علاج کروایا۔ اُس کی بیوی اور بہو نے اُس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ وہ پورا دن پوری رات اُس کی خدمت میں مصروف رہتیں مگر افاقہ نہ ہو سکا۔ اور باپ چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

سوال نمبر 2 (الف)۔ ۳

بیٹے کو کتبہ مکان کی صفائی کے دوران ملا۔ باپ کی موت کے بعد بڑا بیٹا ایک دن مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری سے اُسے کتبہ ملا۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

سوال نمبر 2 (الف)۔۴

بیٹا چونکہ باپ سے بے حد محبت کرتا تھا اس لیے کتبے پر باپ کا نام
دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور وہ محویت
کے عالم میں اس پر خطاطی و نقش و نگار دیکھتا رہا۔ بعد میں
اُسے ایک بات سوجھی جس نے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا
کر دی اور وہ کتبے کو لے کر سنگ تراش کے پاس چلا گیا۔

....

سوال نمبر 2 (الف)۔۵

کتبہ دیکھتے دیکھتے جب بیٹے کو ایک بات سوجھی اور اُس کے ذہن
میں اُس کتبے کے لیے استعمال آیا تو اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں
وہ اگلے ہی روز اس کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا
اور اس کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اُسے باپ کی قبر
پر نصب کر دیا۔

....

سوال نمبر 2 (الف)۔۶

سوال نمبر 2 (الف)۔ ۷

سوال نمبر 2 (ب)۔ ۱

بند کے مطابق وطن اور اہلِ وطن کو اپنے بہادر نوجوانوں کی تیز
تلواروں پر فخر اور ناز ہے۔ شاعر نوجوانوں کو مخاطب کرتے
ہوئے کہتا ہے کہ تمہاری تلواریں اس وطن کی بقا کی ضامن
ہیں۔ یہ ایمان اور یقین سے بنے ہوئے فولاد ہیں جو ہمیشہ
حق کے لیے نیاموں سے نکلتے ہیں۔ اُن کی تیزی اور لپک سے
دشمن بچ نہیں سکتا اور یہی وطن کے لیے باعثِ فخر بات ہے۔

سوال نمبر 2 (ب)۔ ۲

وطن کے عروج و زوال اور اُس کی زندگی و موت کا انحصار اُس
کے نوجوانوں پر ہے۔ جب تک کسی قوم کے نوجوان اپنے وطن کے لیے
اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہوں کوئی بھی دشمن اُن
کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ لیکن اگر نوجوان ہتھیار
ڈال دیں اور راہِ فرار اختیار کر لیں تو وطن بھی دیمک لگے درخت

سوال نمبر2(ب)۔۳

سوال نمبر2(ب)۔۴

اس بند کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہماری مسلح افواج ہی ہماری بقا کی ضامن ہیں۔ انھی کے دم سے ہماری زندگی ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے دل میں وطن کے لیے محبت کا جذبہ موجود ہے اور یہ جذبہ انھیں وطن کے لیے کچھ کر گزرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اپنی تیز تلواریں اٹھائے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اہلِ وطن کے لیے باعثِ فخر ہیں۔

سوال نمبر2(ج)۔۱

آدابِ عشق کا تقاضہ ہے کہ جب راہِ عشق اختیار کر لی جائے تو پھر محبوب کے ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنا چاہیے اور آہ و فریاد نہیں کرنی چاہیے۔ مذہبِ عشق اس بات کا متقاضی ہے کہ محبوب کے بے پناہ مظالم کو ہنس ہنس کر برداشت کیا جائے اور کبھی محبوب سے شکایت نہ کی جائے نہ ہی محفل میں

سوال نمبر 2 (ج)۔۲

سوال نمبر 2 (ج)۔۳

تیسرے شعر میں شاعر نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس دنیا میں جو بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوتا ہے اور اُس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس لیے شاعر کسی بھی بات پر حیرت کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنی قسمت پر صابر شاکر ہے۔ وہ اللہ کی ذات پر یقین کیے ہوئے ہے اور اُس کی رضا میں راضی ہے خواہ فیصلہ اُس کے حق میں ہو یا اُس کے خلاف۔

سوال نمبر 2 (د)۔۱

"کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جو ایک دوسرے کے درمیان فرق واضح کریں صنعتِ تفریق کہلاتا ہے۔ مثلاً

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

سوال نمبر2(د)۔۲

" ایسے افعال جو اصل فعل کے ساتھ مل کر مرکب بناتے ہیں اور اُس کے مکمل کو معانی اور واضح کرتے ہیں اور کام کی تکمیل کرتے ہیں امدادی افعال کہلاتے ہیں۔

الف۔ دو (دینا سے)
ب۔ اُٹھا (اُٹھنا سے)
ج۔ لیا (لینا سے)

سوال نمبر2(د)۔۳

سوال نمبر3 (صفحہ نمبر 1/4) الف۔

اقتباس کی تشریح

حوالۂ متن:
سبق کا عنوان: منظور
مصنف کا نام: سعادت حسن منٹو

تشریح:
سعادت حسن منٹو اردو کے بہترین اور سب سے متنازعہ افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ناقدین کے مطابق وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے جب کہ تحریکِ ترقی پسند والے انہیں قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہایت خوبصورتی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ شاملِ نصاب سبق ایک افسانہ ہے جو اُن کی کتاب "منٹو کے بہترین افسانے" سے لیا گیا ہے۔ یہ ایک معذور بچے منظور کی کہانی ہے جو اپنی مثبت سوچ کی وجہ سے دوسروں میں اُمید پیدا کرتا ہے۔ اپنی اچھائی اور پراُمید شخصیت سے ہر کسی کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ وہ اس افسانے کے دوسرے کردار اختر جو مایوسی کا شکار تھا اُس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتا ہے۔

اس اقتباس میں مصنف بیان کرتے

منظور کا ہی تھا جو اپنی معصومانہ آواز میں اختر کو سلام کیا کرتا تھا، اس سے اس کا حال دریافت کرتا تھا اور اس کے لیے دعا کرتا تھا۔ ایک دن جب اختر مرتے مرتے بچا اور ڈاکٹر بھی اس کی صحت یابی سے حیران تھے تو منظور نے اُسے بتایا کہ وہ اس کے لیے دعا کیا کرتا تھا کہ اس کے اختر ڈھلی بچ جائیں۔ اختر کو جیسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ اُس کو کسی ڈاکٹر یا کسی دوائی نے نہیں بلکہ اس معصوم بچے کے دل سے نکلنی والی دعا نے بچایا تھا

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

یہی وجہ ہے کہ اختر اُسے اپنا مسیحا اور مددگار سمجھنے لگا۔ دراصل اختر کی ساری زندگی سخت مشکلات میں گزری اور وہ زندگی سے بہت ناامید تھی۔ جب اُسے ہسپتال لایا گیا تو وہ مر جانے کو ہی بہتر سمجھ رہا تھا۔ مگر منظور کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ انسان کو خوشی اور امید کے ساتھ اپنی پریشانیاں کاٹنی چاہیے۔ منظور کے مثبت رویے نے اس کے اندر ایک نئی اُمید پیدا کردی اور اسے ایک نئی زندگی عطا کردی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک جس منفی سوچ، ناامیدی اور مایوسی کے ساتھ وہ زندگی گزارتا آیا تھا وہ منظور نے کچھ دنوں میں بدل کر ایک پرامید اور پرعزم زندگی کی بنیاد رکھ دی۔ اختر

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 3/4)

اُس کی قنوطیت یعنی مایوسی رجائیت یعنی امید میں بدل گئی اور وہ زندگی میں دلچسپی لینے لگا۔ اپنے مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔ ترقی کی خواہش اُس کے دل میں آہستہ آہستہ گھر کرنے لگی۔ گویا وہ نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اب انتظار کرنے لگا کہ کب وہ ہسپتال سے نکلے گا اور اپنی عملی زندگی میں قدم رکھے گا۔ ایک بہتر انسان کی طرح معاشرے میں اپنا کردار ادا کرے گا اور ایک خوشگوار اور کامیاب زندگی گزارے گا۔ اُس کو اب یہ یقین آگیا تھا کہ ناامیدی انسان کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتی ہے۔ چنانچہ اُس نے منظور کی رہنمائی میں اُس سے چھٹکارا پا لیا تھا۔

نہ ہو نو امید، نوامیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

سوال نمبر3 (صفحہ نمبر 4/4)

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1/4) ب۔

نظم کا نام:- مناظرِ سحر
شاعر کا نام:- جوش ملیح آبادی

تشریح:-

جوش ملیح آبادی کی شاعری میں ایک طرف کلاسیکی سج دھج ہے تو دوسری طرف جدید انداز و آہنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ انہیں شاعرِ فطرت اور شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں وہ صبح کے خوبصورت منظر کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ صبح ہوتے ہی ہر طرف اجالا ہونے لگتا ہے۔ اجالا ہوتے ہی ہر طرف کلیاں چٹکنے لگتی ہیں۔ کلیوں کے چٹکنے ہی ہر طرف خوشبو پھیل جاتی ہے۔ یہ خوشبو پوری فضا کو معطر کر دیتی ہے۔

صبح کا پیارا آسماں ہے کس قدر کیف آفریں
جنتُ الفردوس سے بڑھ کر ہے پہنائے زمیں

صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی تارے آسمان سے رخصت ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہوتے ہی چاندنی مدہم۔ اس مدہم چاندنی میں چاند کا عکس دکھائی دیتا ہے جو صبح کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس غروب ہوتی

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 2/4)

قطروں میں ڈھل کر پتیاں نکھر جاتی ہیں اور اُن کی شگفتگی اور ترو تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

شاعر بیان کرتا ہے کہ صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ماحول میں ایک الگ کیف و سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ٹھنڈی ہوا میں سبزہ جھومنے لگتا ہے اور کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔ ہر طرف ہریالی ہوا کے ساتھ لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور ماحول کو پر لطف بنا دیتی ہیں۔

چلنا بادِ صبا کے جھونکوں کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں وہ طاؤس کی پکار

شاعر کہتا ہے کہ سبزہ جھومتا ہے تو شاخیں ایک دوسرے کے قریب آتی جاتی ہیں۔ ان قریب آتی ہوئی شاخوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہوں۔ شاعر نے بڑی خوبصورتی سے جھولتی ہوئی شاخوں کو گلے ملتے انسانوں سے تشبیہ دی ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ یہ شاخیں ایک دوسرے سے گلے مل کر اپنی خوشی

ہیں جیسے آج عید کا موقع ہو۔ نسیم سحری یا بادِ صبا اُسے "عید سحر" کہتی ہے یعنی صبح کی عید۔ صبح کا وقت پودوں اور پھولوں کے لیے انتہائی خوشی اور مسرت کا وقت ہوتا ہے اس لیے وہ اس وقت جھومتی اور گلے ملتی ہیں۔

سو گلے ملتے ہوئے جھومتی شاخیں
ہیں نغمہ زن کہ آج عید سحر ہے

سوال نمبر 4 (صفہ نمبر 4/4)

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1/6) **الف۔**

شاعر کا نام:- احمد ندیم قاسمی

شعر نمبر ۱۔

اس شعر میں شاعر نے فلسفۂ جز و کل کو موضوع بنایا ہے شاعر کہتا ہے کہ یوں کہتا ہے کہ موت آئی تو میں مر جاؤں گا۔ میں تو دریا کی طرح سمندر کا حصہ بن جاؤں گا۔ دراصل صوفیاء کے فلسفۂ جز و کل کے مطابق چونکہ انسان اپنے مرکز سے جدا ہے اس لیے جب اُسے موت آتی ہے تو ظاہر تو وہ فنا ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں اس کی رُوح اس کے کل میں مل جاتی ہے اور یوں انسان کے نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ صوفیاء نے تو یہاں تک کہا ہے

ع موت آ گیا کہ دوست کا پیغام آ گیا

فنا اور بقا کا باہمی ربط صدیوں سے ہماری فکری اور شعری روایات کا موضوع ہے۔ غالب کے نزدیک تو موت ایک مختصر قیام ہے جہاں سے آگے چلنا لازم ہے

ع موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

Cutting Line

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2/6)

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ میں مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاؤں گا بلکہ دریا کی مانند سمندر کا حصہ بن جاؤں گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ازل سے ایک مقرر شدہ دائرے پر گردش کر رہا ہے۔ اور آہستہ آہستہ تاطل ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے لیے موت زندگی کے ایک نئے افق سے پرواز کا نام ہے جس کے بعد انسان کی حقیقی اور ابدی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

سو پھیل جاؤں گا میں چاروں طرف خلا کی طرح
ابھی وجود ہے میرا فصیلِ جاں میں اسیر

شاعر اپنے آپ کو ایک دریا سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنی دائمی اور اخروی زندگی کو سمندر سے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ ایک مقررہ وقت پر روح اور جسم کا تعلق ٹوٹ جائے گا اور ہماری روح اپنے حقیقی سفر پر روانہ ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کو شاعر نے اس شعر میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 3/6)

شعر نمبر ۲۔

اس شعر میں شاعر بیان کرتا ہے کہ ایک عاشق کو اپنے محبوب کے در کے علاوہ کہیں سکون نہیں ملتا۔ دراصل،

سو بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

ایک عاشق کی زندگی کا مقصد محبوب سے ملاقات اور اُس کا دیدار ہوتا ہے۔ اِس لیے وہ ہر لمحہ محبوب کے در کا سوالی بن کر بیٹھا رہتا ہے کہ نہ جانے کب اُسے محبوب کی نظرِ کرم نصیب ہو جائے اور کب محبوب اُسے شرفِ ملاقات بخش دے۔

سو تیرے کوچے پر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مگر محبوب کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ عاشق اُس کی گلی میں موجود ہو۔ وہ اُسے کسی نہ کسی بہانے سے وہاں سے نکال دیتا ہے اور عاشق اپنے ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 4/6)

س۔ بہت آرزو تھی گلی کی تیری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

مگر وہ پھر بھی اپنی روش سے باز نہیں آتا۔ وہ محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں تیرا در چھوڑ کر کدھر جاؤں گا۔ مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملتا۔ تجھ سے دوری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی اور میں پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میرے پاگل پن کو دیکھ کر میرے دوست احباب پابند کر دیتے ہیں یا پھر میں اپنی دیوانگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنگلوں بیابانوں کا رخ کر لیتا ہوں اور در بدر بھٹکتا رہتا ہوں۔ اس شعر سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ انسان کو سکون صرف اللہ کی بارگاہ پر جھکنے سے ہی ملتا ہے۔ کیونکہ وہی قادر مطلق اور مالک کل ذات ہے۔ اُسی کے در پر انسان کو پناہ ملتی ہے اور انسان کی حاجت روائی اور مشکل کشائی ہوتی ہے۔ اس لیے اولیاء اللہ کے حضور ہر وقت عاجزی و انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کا کرم و حرم طلب کر رہے ہوتے ہیں۔

س وہ اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

شعر نمبر ۳۔

اس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں کہیں بھی چلا جاؤں میرے تصور میں ہر وقت تیری ہی صورت موجود ہوتی ہے۔ دراصل شاعر کا کہنا ہے کہ میں اپنی بے پناہ محبت کے سبب ہمیشہ محبوب کو اپنے قریب محسوس کرتا ہوں۔ اُس کی صورت ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اس لیے اُس سے دور جانا میرے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ میں کہیں بھی چلا جاؤں ~~صد~~ مجھے چاروں طرف ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ ہے میرے محبوب کی صورت۔

سو ذرے ذرے میں تیرا عکس دکھائی دیتا ہے
اب تو راستہ دیکھتے رہنا بھی دشوار ہو گیا

دراصل عاشق اپنے محبوب سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہی اُس کی زندگی کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اُسے اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اب تو ہر حال میں وہ اپنے محبوب کی گلی میں دم دے دے گا اور وہیں خاک میں مل جائے گا۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 6/6)

متعلقہ سوال کا جواب صرف مختص کردہ جگہ پر اور بیرونی نشان کے اندر دیا جائے۔

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1/3)

روداد نویسی

اقبال ایک ایسی ہستی ہیں جن پر نہ صرف اہلِ پاکستان بلکہ پوری
دنیا فخر کرتی ہے وہ مفکرِ پاکستان اور شاعرِ مشرق ہیں۔
ہر سال اُن کے اعزاز میں ہمارے کالج میں یومِ اقبال کی تقریب
منعقد ہوتی ہے۔ اِس سال بھی ۲۱ اپریل صبح 10 بجے کالج ہال
میں یومِ اقبال کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب کی
تیاریاں پچھلے مہینے سے جاری تھیں۔ ہال کی آرائش پر بھی
خاص محنت کی گئی تھی۔ دیواروں پر علامہ محمد اقبال کی تصویریں
اور اُن کی شاعری تھیں۔ پورے ہال کو سفید پھولوں سے
سجایا ہوا تھا۔ سبز رنگ کا قالین بچھا تھا۔ پہلی نشست میں
صوفے اور پیچھے کرسیاں بہت ترتیب اور سلیقے کے ساتھ رکھی
گئی تھیں۔ سٹیج کے درمیان میں سٹیج سیکریٹری کے لیے
مائک رکھا گیا تھا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر عبدالحامد مشرقی
صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔ وہ ہمارے شہر کے ایک نامور
ادیب اور شاعر ہیں اور بہت پایہ شناس بھی ہیں۔ 10
بجے ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور پرنسپل صاحب
کچھ اساتذہ کے ساتھ مہمانِ خصوصی کے استقبال کے
لیے باہر موجود تھے۔ عین 10:15 پر مہمانِ خصوصی تشریف لائے۔
تالیوں کے بھرپور شور میں اُن کا استقبال کیا گیا
پھر باقاعدہ طور پر تقریب کا آغاز کیا گیا۔ سب سے
پہلے کالج کے قاری نے تلاوتِ قرآن پاک سے پوری فضا پر
محویت طاری کر دی۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے نبی

Cutting Line

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2/3)

میں تو خود ان کے در کا گدا ہوں
اپنے آقا کو میں نذر کیا دوں

تقریب کے آغاز میں سال دوم کے ایک طالب علم نے سٹیج پر آکر اقبال کے **فلسفۂ خودی** پر ایک زوردار تقریر کی اور سب کی داد وصول کی۔ اس نے اپنی تقریر کا اختتام ان اشعار پر کیا

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کے بعد ایک اور طالب علم آیا اور اُس نے اقبال کے تصورِ **شاہین** کو بیان کرتے ہوئے ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم کس قدر اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہیں اور اقبال نے ہمارے لیے کیوں شاہین کا استعارہ استعمال کیا تھا۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 3/3)

پوری ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ تقریب کے اختتام پر مہمانِ خصوصی کو بھی سٹیج پر مدعو کیا گیا۔ انہوں نے پرنسپل، اساتذہ اور طالب علموں کو اس تقریب پر مبارک باد دی اور اقبال کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پرنسپل صاحب نے مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کیا اور تقریب کے اختتام پر قومی ترانہ پڑھا گیا۔ یوں یہ دن اپنے اختتام کو پہنچا مگر میری یادوں میں یہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

ب۔ سائنس کا ارتقا

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان نے پچھلے کچھ سالوں میں ترقی کی وہ منازل طے کی ہیں جو ایک زمانہ میں ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ آج کی دنیا بہت ترقی کر چکی ہے۔ ایسی ایسی ایجادات کہ اگر زمانہ قدیم کا انسان زمین پر تشریف لے آئے تو یقین ہی نہیں کرے گا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ زندگی گزار کر گیا تھا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انسان اپنی عقل و قوت اور صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے محنت کی مدد سے اپنے لیے آسانیاں پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ جان گیا ہے کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ تو ہمارے دین کا بھی تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس کائنات پر غور و فکر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے رہنے کے لیے اس زمین میں بہت سے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فہم کو استعمال کر کے ان سے فائدہ اٹھائے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ

"

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2/7)

آج سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی ایجاد بجلی ہے جس نے ہماری زندگیوں کو آسان بنا دیا ہے۔ اب بٹن دبایا اور سارے کام ہو گئے۔ کپڑے دھل گئے، استری ہو گئے، لفٹ چل پڑی، کھانا گرم ہو گیا، کمرہ گرم ہو گیا۔ غرضیکہ انسان کے بیشتر کام تو اس بجلی اور اس سے چلتی مشینوں سے سنبھال لیے ہیں۔

پھر دوسرے نمبر پر آجاتا ہے موبائل فون۔ یہ ایک ایسی ایجاد ہے جس نے رابطے کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اب ہم میلوں دور بیٹھے نہ صرف اپنے قریبی رشتوں سے بات کر سکتے ہیں بلکہ اُن کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں کسی کی خیریت دریافت کرنی ہوتی تھی یا کوئی بات بتانی ہوتی تھی تو خط لکھنا پڑتا تھا اور ڈاک کے ذریعے بھجوانا پڑتا تھا۔ اس میں کئی دن لگ جاتے تھے اور بعض اوقات پیغام دیر سے پہنچنے کے سبب بہت سے کاموں میں دیر ہو جاتی تھی۔ موبائل فون نے اس مشکل کو بھی آسان کر دیا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ موبائل نے اس دنیا کو ایک "گلوبل ویلج" میں تبدیل کر دیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

موبائل سے ملتی جلتی ایک اور ایجاد ہے کمپیوٹر۔ زمانۂ قدیم میں کاروبار، بینک اور اس طرح کے دیگر شعبوں میں لوگوں کو جمع تفریق کے کام خود کرنے پڑتے تھے

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 3/7)

منٹوں میں ہو جاتا ہے اور بغیر کسی غلطی کے۔ لحاظہ کمپیوٹر نے
بھی ہماری زندگی میں بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔
اب آ جاتے ہیں انٹرنیٹ کی طرف۔ یہ کوئی عام چیز تو
نہیں ہے بلکہ ایک ایسا نیٹ ورک ہے جس نے موبائل
اور کمپیوٹر کی رفتار اور اس کے کام کو بہتر بنا دیا ہے۔
انٹرنیٹ کے ذریعے اب ہم گھر بیٹھے معلومات حاصل کر
سکتے ہیں اور ہمیں لائبریریوں کے چکر نہیں لگانے
پڑتے۔
بے شمار ایجادات میں ایک گاڑیاں، موٹرسائیکل،
ٹرین اور جہاز وغیرہ بھی ہیں۔ ان ایجادات نے سفر
کو انتہائی آسان بنا دیا ہے۔ پہلے کہیں جانے سے
پہلے انسان کو سوچنا پڑتا تھا مگر اب دنوں کا سفر
گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ
ساتھ ان سواریوں کو آرام دہ بھی بنایا جا رہا ہے۔
ٹی وی ایک ایسی ایجاد ہے جس نے ہماری تفریح
کا سامان میسر کیا ہے۔ ظاہر انسان کو اپنی زندگی میں
لطف اندوز ہونے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔
وہ اس ٹی وی اور ریڈیو نے فراہم کیا ہے۔ اس پر چلنے
والے دلچسپ پروگرام انسان کی تھکاوٹ دور کرتے
ہیں۔
لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں ان سائنسی

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 4/7)

دوسری طرف اس کے بہت سے منفی پہلو بھی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہے کہ انسان سست اور کاہل ہوگیا ہے۔ وہ اپنے کام ~~سے~~ خود کرنے میں عار محسوس کرتا ہے اور دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ وہ اقبال کے اس مصرعے کا عکاسی بن گیا ہے۔

ہے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسان مادہ پرستی کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ دنیاوی فائدوں کے حصول کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ اُس نے اپنی عیش پرستی اور تن آسانی کے باعث اعلٰی اوصاف گنوا دیے ہیں۔

سو گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اگرچہ سائنس نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ آج ہم چاند ستاروں کی دنیا پر بھی کمند ڈال چکے ہیں مگر اخلاقی طور پر ہم پستی کا شکار ہیں۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 5/7)

جب تک انسان اس دنیا پر موجود ہے ترقی کا یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 6/7)

Cutting Line

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 7/7)